بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

اشارات

ایک طویل مدت کے بعد ان صفحات میں پھر اظہارِ خیال کا موقع مل رہا ہے۔ اس مدت میں اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت و ربوبیت کے جو تجربات ہوئے وہ اس سے بہت زیادہ ہیں کہ یہ بندۂ عاجز ان کے شکر کا حق ادا کر سکے، اور اس بندے کے گناہ اس سے بدرجہا زیادہ ہیں کہ یہ اپنے آپ کو مالک کی ان عنایات کا کسی درجے میں بھی مستحق سمجھے۔ دعا ہے کہ جس آقا نے اتنا کچھ فضل و کرم فرمایا ہے وہی اپنے بندے کو اتنی توفیق بھی بخشے کہ وہ مستقبل میں اپنے ماضی کے قصوروں کی تلافی کر سکے اور دینِ حق کی کوئی ایسی خدمت بجالائے جو آخرت میں قبولیت سے نوازی جانے کے لائق ہو۔ اپنے مخلص احباب اور تمام خیر خواہوں سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ وہ میرے حق میں اسی چیز کی دعا فرمائیں۔

میری ناچیز خدمات کو جو لوگ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں انہیں فطرۃً میری خلافِ توقع واپسی پر غیر معمولی مسرت ہوتی ہے۔ ان کی طرف سے اس مسرت کا اظہار جس خلوص و محبت کے ساتھ کیا گیا اس کے لیے میں اُن سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر ضرور عطا فرمائے گا، کیونکہ میرے ساتھ ان کی یہ محبت کسی ذاتی تعلق کی بنا پر نہیں ہے بلکہ محض اللہ اور اس کے دین کی خاطر ہے۔ کاش میرا مولیٰ مجھے فی الواقع اُس حسنِ ظن کا مستحق بنا دے جو اس کے بہت سے بندے مجھ سے رکھتے ہیں، اور مجھ کو ان نیک توقعات کے پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو دینِ حق کی صحیح خدمت کے لیے انہوں نے مجھ سے وابستہ کی ہیں۔

اس کے ساتھ میں یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دوستوں کے اظہارِ مسرت اور جذبۂ محبت و قدر افزائی نے بعض مواقع پر کچھ ایسی شکلیں اختیار کی ہیں جن میں اعتدال کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ میرے لیے ان کو روکنا بھی مشکل ہوتا ہے، کیونکہ زہد و انکسار کی نمائش مجھے پسند نہیں ہے، اور ان کو گوارا کرنا بھی مشکل ہوتا ہے، کیونکہ

میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ چیزیں اپنے اندر فتنہ بننے کی اچھی خاصی صلاحیت رکھتی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ میرے دوست کم از کم میرے متعلق اپنے جذبات کے اظہار میں حدِ اعتدال سے بھی کچھ کم ہی پر اکتفا کیا کریں۔

میری غیر حاضری کا زمانہ اگرچہ بکثرت حوادث سے لبریز گذرا ہے، لیکن دو حادثے خصوصیت کے ساتھ ایسے تھے جنہوں نے مجھے سخت متأثر کیا۔

ان میں سے پہلا حادثہ مولانا مسعود عالم ندوی کی وفات کا ہے جس کا نقصان کچھ وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو ان کے اوصاف اور کاموں سے واقف ہیں۔ وہ اس ملک کے اُن چند گنے چنے لوگوں میں سے تھے جن کو عربی ادب و انشا میں ایک بلند مقام حاصل ہُوا ہے۔ اپنی اس قابلیت سے کام لے کر انہوں نے برِعظیم ہند و پاکستان کے مسلمانوں اور عربی زبان بولنے والے مسلمانوں کے درمیان سفارت کے وہ فرائض انجام دیے جو شاید اس دور کے کسی دوسرے شخص نے کم از کم اس حد تک انجام نہیں دیئے۔ عرب ممالک کو یہاں کے حالات اور مسائل اور تحریکوں سے روشناس کرنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اور اس خدمت کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں معلوم ہے کہ مختلف مسلمان ملکوں کے درمیان براہِ راست ذرائع معلومات کا نہ ہونا اور ان کا ایک دوسرے کو جاننے کے لیے محض فرنگی وسائلِ اطلاعات پر انحصار کرنا کتنا نقصان دہ ہے۔ اس لحاظ سے ان کی وفات درحقیقت ایک قومی نقصان ہے جس کی تلافی کرنے والے کم ہی نظر آتے ہیں۔

جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والوں نے ان کے فقدان کو خاص طور پر شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے، کیونکہ انہیں مرحوم کی خوبیوں اور خدمات سے براہِ راست سابقہ پیش آیا ہے۔ وہ ایک ایسے حلقے سے تعلق رکھتے تھے جس کے اکابر جماعت اسلامی کو پسند نہ کرتے تھے۔ دوسری طرف، جماعت اسلامی کی بنا جن لوگوں نے ڈالی تھی اُن میں سے کسی کے ساتھ بھی مرحوم کے شخصی مراسم نہ تھے بلکہ مجھ میت، اکثر سے ان کی کبھی ملاقات تک نہ ہوئی تھی۔ اس کے باوجود مرحوم نے محض "ترجمان القرآن" میں جماعت اسلامی کی دعوت اور

نصب العین پڑھ کر بلا تکلف اس کو قبول کیا اور خود اس کی طرف بڑھنے میں پیش قدمی کی، بغیر اس کے کہ ادھر سے کوئی تحریک کی گئی ہو۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ ان کا دل تعصب سے پاک تھا، وہ اپنی رائے میں آزاد تھے، ان کا ضمیر انصاف پسند تھا، اور وہ جس چیز کو حق پاتے تھے اسے پورے خلوص کے ساتھ قبول کر لیتے تھے۔ بعد میں تیرہ چودہ سال کے قریبی تعاون کے دوران میں ہر موقع پر ان کے یہ اوصاف عملاً مشاہدے میں آتے رہے۔ اس کے ساتھ ذہنی توازن کا یہ حال تھا کہ جماعت سے گہرا تعلق ہو جانے کے بعد بھی اپنے اُن اکابر سے ان کے ذاتی تعلق میں کوئی فرق نہ آیا۔ نہ اُن کی محبت و عقیدت جماعت کے ساتھ ان کی وابستگی میں کبھی خلل انداز ہوئی اور نہ جماعت سے وابستگی نے اُن کے ساتھ شخصی روابط کو کبھی غبار آلود کیا۔

جماعت میں شامل ہوتے ہی انہوں نے محسوس کر لیا کہ جس نصب العین کو اب وہ اختیار کر چکے ہیں وہ ہمہ تن پوری زندگی کا وقف نامہ طلب کرتا ہے۔ چنانچہ کچھ دیر نہ گزرنے پائی تھی کہ وہ اپنی ساری کشتیاں جلا کر آ گئے اور جماعتی نظام کے تحت انہوں نے "دار العروبہ" قائم کیا جس کا مقصد تحریک اسلامی کے لٹریچر کو عربی میں منتقل کر کے انڈونیشیا سے مراکو تک پھیلی ہوئی اسلامی دنیا تک پہنچانا تھا۔ اس کے ساتھ انہوں نے ایسے نوجوان تیار کرنے کی کوشش بھی شروع کر دی جو صحیح عربی لکھنے پر قادر ہوں تاکہ وہ ان کے کام کو آئندہ جاری رکھ سکیں۔ اور یہ سب کچھ انہوں نے ایک ایسی جانگسل بیماری کی حالت میں کیا جس نے ان کو گھلا کر صرف ہڈی اور چمڑے کا ڈھانچہ بنا ڈالا تھا۔ یہ ان کے عزم اور اخلاصِ نیت اور جذبۂ ایثار و قربانی کا حال تھا۔ وہ ایک چیز کو حق جاننے کے بعد اسے صرف قبول ہی کر کے نہ رہ گئے، بلکہ اس کو فروغ دینے کے لیے انہوں نے اپنی جان لڑا دی، اس کی خاطر اپنی دنیوی ترقی کے سارے مواقع کو (جو ان جیسی قابلیت کے آدمی کے لیے کچھ کم درخشاں نہ تھے) قربان کر دیا، اپنا سارا وقت اور سارا سرمایۂ قوت و صلاحیت اسی ایک راہ میں کھپا دیا۔ یہ خوبی جہاں، جس انسان میں بھی پائی جاتی ہو، بجائے خود قابلِ قدر ہے۔ خصوصاً ہماری قوم میں تو اس وقت اس صفت کے حامل لوگوں کا قحط ہے۔ اس لیے ان کی قدر و قیمت اس سے بدرجہا زیادہ ہے

جو کسی "مالدار" قوم میں ہو سکتی ہے۔

۱۹۵۳ء میں جماعت اسلامی پر جو دورِ ابتلا آیا (بلکہ سچ یہ ہے کہ زبردستی لایا گیا) اس میں مرحوم کا صبر و ثبات ہم سب کے لیے قابلِ رشک ہے۔ وہ سالہا سال سے دمے کے مریض تھے، ایسے سخت مریض کہ دمے کے دورے کی وہ شدت کبھی ہمارے مشاہدے میں نہیں آئی۔ ان کی صحت تمام تر دوا اور غذا کے خاص اہتمام اور اوقات کی باقاعدگی پر منحصر تھی، اور ان چیزوں میں سے کسی میں بھی فرق آجانا ان کے لیے پیامِ موت تھا۔ اس حالت میں حکومت نے یکایک ان کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا اور ان کے مرض کا لحاظ کر کے علاج و غذا کا کوئی خاص انتظام نہ کیا۔ حتیٰ کہ اس مریضِ ناتواں کو جیل میں چارپائی تک نہ دی گئی۔ جو لوگ اس ظلم کے ذمہ دار تھے ان کو قطعاً کوئی احساس نہ تھا کہ وہ اپنی قوم کے کیسے قیمتی جوہر کو ضائع کر رہے ہیں۔ اور مرحوم کی غیرت یہ گوارا کرنے کے لیے تیار نہ تھی کہ اپنے مرض کا حوالہ دے کر کسی ظالم سے رحم کی بھیک مانگیں۔ جو تکلیفیں بھی پیش آئیں کمال درجہ صبر اور تسلیم و رضا کے ساتھ جھیلتے چلے گئے اور اُف تک نہ کی۔ بعید نہیں کہ یہی چیز آخر کار ان کی اچانک وفات کی موجب ہوئی ہو۔ بہرحال چلتے چلتے اس مردِ مومن نے استقامت کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا جو بہت سے اہلِ ایمان کے لیے تقویتِ قلب کا سبب بنا اور انشاء اللہ آئندہ بھی بنے گا۔

تیرہ چودہ سال کی رفاقت میں ہم لوگوں نے ان کو ہمیشہ ایک مخلص دوست، ایک بے لاگ مشیر اور ایک وسیع القلب و وسیع النظر انسان پایا۔ بہت سی باتوں میں دوسروں سے اختلاف رکھنے، اور حسبِ ضرورت اظہارِ اختلاف کرنے کے باوجود وہ اپنی رائے میں کبھی اتنی شدت اختیار نہ کرتے تھے کہ ان کے ساتھ موافقت مشکل ہو جائے۔ رائے میں نہایت آزاد اور اظہارِ رائے میں نہایت بیباک تھے مگر بحث و تمحیص کے بعد جب جماعت کوئی فیصلہ کر لیتی تھی تو اسے پوری فراخ دلی کے ساتھ قبول کر لیتے تھے اور اسے کامیاب کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اپنی رائے کے خلاف کسی جماعتی فیصلے پر وہ کبیدہ خاطر ہوئے ہوں، یا ان کے گوشۂ قلب میں بھی یہ خواہش چھپی ہوئی پائی گئی ہو کہ وہ فیصلہ ناکام

ہو اور انکی رائے کی صحت ثابت ہو جائے ۔ اجتماعی زندگی کے لیے یہ صفت اکسیر کا حکم رکھتی ہے ۔ ذاتی حیثیت سے ان کی وفات میرے لیے ایک صدمۂ عظیم ہے ۔ تعریف اور مذمت کرنے والوں کی کمی نہیں ہے ، مگر خیر خواہ ناصح دنیا میں کم ہی میسر آتے ہیں ۔ رحمۂ اللہ و طاب ثراہ

دوسرا اور اس سے بدرجہا زیادہ شدید حادثہ مصر میں اخوان المسلمون پر فوجی آمریت کے مجنونانہ حملے کا تھا جس کی اطلاعات نے قلب و روح کو مدتوں سخت اذیت میں مبتلا رکھا اور جس کی اذیت اب بھی کم نہیں ہوئی ہے ۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے اخوان اور ان پر ظلم کرنے والے فوجی حاکم دونوں یکساں ہیں ۔ ایمان کے رشتے نے دونوں کو ہمارا بھائی بنایا ہے اور ہم ان کے درمیان اپنے اور غیر کی تمیز نہیں کر سکتے ۔ لیکن ایمان ہی نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ ہم ظالم اور مظلوم میں فرق کریں ، ظالم کا ہاتھ پکڑیں یا کم از کم اس کے ظلم کو برا جانیں ، اور مظلوم کے حق میں انصاف کی بات کہیں ۔ علاوہ بریں ہمارے لیے ، جب تک کہ ہم مسلمان ہیں ، قومی اور نسلی اور وطنی تفریقیں کوئی چیز نہیں ہیں ۔ ہم پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک میں کوئی فرق نہیں سمجھتے ۔ مسلمان جہاں بھی ہے ہمارا بھائی ہے ، اور اس کا گھر ہمارا گھر ہے ۔ مشرق سے لے کر مغرب تک جس مسلمان ملک میں بھی کوئی خرابی رونما ہوتی ہے اس پر ہم ویسی ہی اذیت محسوس کرتے ہیں جیسی اپنے ملک میں کسی خرابی کے پیش آنے پر کر سکتے ہیں ۔ یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے ، اور ہم یہ بات کبھی نہیں مان سکتے کہ ہر ملک کے مسلمان اپنے اپنے ملک سے غرض رکھیں ، دوسرے مسلم ممالک کے معاملات میں دخل نہ دیں ۔ ایک مسلمان ملک یا اس کی حکومت کو غلط راستے پر جاتے ہوئے دیکھ کر آخر ہم یہ کہے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں کہ وہ غلط راستے پر جا رہا ہے ۔

مصر کے فوجی حکمران اگر اس بات سے غافل ہیں تو انہیں اس سے آگاہ کرنا ہمارا فرض ہے کہ ان کے تمام پروپیگنڈے کے باوجود ، اور صحیح اطلاعات پر پردہ ڈالنے کی ساری کوششوں کے باوجود ، دنیا کو یہ یقین نہیں آ سکا ہے کہ اخوان کو کچلنے کے لیے جس سیاسی جرم کو انہوں نے بنیاد قرار دیا وہ فی الواقع اخوان کا جرم تھا ۔ چند مسحور ،

یا اقتدار پرست یا متعصب لوگوں کے سوا ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ در اصل یہ ایک سازش کا نتیجہ تھا جو نہایت بھونڈے پن اور بد سلیقگی کے ساتھ محض اس غرض کے لیے کی گئی تھی کہ فوجی حکمراں اپنے ملک کی آخری با اثر حزبِ مخالف کو بھی ختم کر دینے کے لیے ایک بہانہ پیدا کر سکیں۔ اس گمان کو جس چیز نے یقین کی حد تک پہنچا دیا وہ فوجی حکمرانوں کا رچایا ہوا وہ مضحکہ انگیز عدالتی ڈراما تھا جو اخوان پر مقدمہ چلانے کے لیے انہوں نے بغیر کسی شرم و حیا کے ساری دنیا کو دکھایا۔ ممکن ہے کہ فوجی حکمراں اس غلط فہمی میں ہوں کہ دنیا نے اُن کی قائم کردہ "عدالتوں" کو واقعی عدالت ہی سمجھ لیا اور یہ باور کر لیا کہ اخوان باقاعدہ ایک عدالتی کارروائی کے بعد مجرم ثابت ہو گئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ڈرامے سے اخوان کا جرم ثابت کرنے کے بجائے مصر کے موجودہ حکمرانوں نے اپنے اخلاق کی ایک ایسی گھناؤنی تصویر دنیا کے سامنے پیش کی جس پر کوئی شریف آدمی فخر نہیں کر سکتا۔ شاید یہ بات بغیر کسی مبالغے کے کہی جا سکتی ہے کہ چشمِ فلک نے روئے زمین پر عدالت کے نام سے ایسا شرمناک ڈراما ہوتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کے بعد جو سزائیں اخوان کو دی گئیں، جس طرح چند نہایت قیمتی جانوں کو ضائع کیا گیا، جس طرح تیس چالیس ہزار انسانوں کو حوالۂ زنداں کیا گیا، جس طرح قیدیوں کی آزادی سلب کرنے پر بھی فوجی حکمرانوں کے دل ٹھنڈے نہ ہوئے اور انہیں حالتِ قید میں ہولناک عذاب دیئے گئے اور آج قیدیوں کے بال بچوں کو بھوکا مارنے کے لیے ان کے تمام ذرائعِ رزق بند کرنے کی جو تدبیریں کی جا رہی ہیں، اُس کے تمام واقعات دنیا کے سامنے آ چکے ہیں۔ اِن کارناموں پر وہ لوگ تو مصری حکمرانوں کو داد دے سکتے ہیں جن کے دل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بغض سے بھرے ہوئے ہیں، مگر ایک مسلمان تو اپنے کسی مسلمان بھائی کو اس ظلم پر، اس برادر کشی پر، اس غیر مہذب، بلکہ غیر انسانی رویّے پر داد نہیں دے سکتا۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے کہ ہندوستان کے ایک شہر میں پنڈت جواہر لال نہرو پر ایک شخص نے حملہ کیا تھا۔ اس پر پنڈت جی نے جو شریفانہ رویّہ اختیار کیا وہ بھی ساری دنیا نے دیکھ لیا، اور مصر کے رئیس الحکومت پر ایک شخص کے اقدامِ قتل نے جو گل کھلائے وہ بھی سب نے دیکھے۔ کیا ایک غیر مسلم کے مقابلے میں ایک مسلمان اور اس کے حامیوں کے اخلاق اور ظرف کی یہ کیفیت دیکھ کر دنیا کا کوئی مسلمان شرم سے سر جھکا لینے کے سوا اور بھی کچھ کر سکتا ہے؟

مصر کے فوجی افسر اس دعوے کے ساتھ اُٹھے تھے کہ وہ اپنے ملک کو شاہ فاروق کے ظلم و استبداد سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ مگر فاروق اور اس کے خاندان نے اپنی پادشاہی کی پوری تاریخ میں جو کچھ کیا تھا اس سے بہت زیادہ ان فوجی افسروں نے تھوڑی سی مدت میں کر ڈالا۔

انگریزوں نے بھی اپنے دورِ تسلط میں اتنا ظلم و ستم نہ کیا تھا حتیٰ کہ سرلی اسٹیک کے واقعۂ قتل پر جو زیادتیاں انہوں نے مصر اور مصریوں کے ساتھ کیں وہ بھی اُن زیادتیوں کے مقابلے میں ماند پڑ گئیں جو کرنل ناصر پر قاتلانہ حملے کو بہانہ بنا کر خود دگھر والے اپنے ہی بھائیوں پر کر گزرے۔

آج دنیا بھر کے مسلمان اُن مظالم پر ماتم کناں ہیں جو شمالی افریقہ کے مسلمانوں پر فرانسیسی ڈھا رہے ہیں مگر ہم کس منہ سے اس کا شکوہ کریں جبکہ ہماری اپنی تلواریں ہمارا گلا کاٹنے میں اغیار کی تلواروں سے کچھ کم تیز نہیں ہیں۔

اِن حالات کی وجہ سے مصر کی عزت دنیا بھر میں مجروح ہو گئی ہے۔ مصر نے اپنے اہلِ علم و فضل، اپنی درسگاہوں، اپنے لٹریچر اور اپنے تمدن کی بنا پر جو وقار حاصل کیا تھا اس کو چند فوجی افسروں نے اپنے سفیہانہ طرزِ عمل سے شدید صدمہ پہنچا دیا۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص بھی ایک ایسے ملک کے متعلق اچھی رائے قائم نہیں کر سکتا جہاں عدالت کے نام سے وہ مذاق کیا جائے جو مصر میں کیا گیا، جہاں بڑے بڑے نامور آدمیوں کو اس نام نہاد ثبوت پر پھانسی اور طویل قید کی سزائیں دی جائیں جس پر دنیا کی کوئی عدالت ایک دن کی بھی سزا نہ دے سکے، جہاں سیاسی قیدیوں کے ساتھ ان کے علم اور ان کی عزت اور مرتبے کا لحاظ کیے بغیر وہ وحشیانہ سلوک کیا جائے جو مہذب ملکوں میں اخلاقی مجرموں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا، جہاں ہزارہا آدمیوں کو قید کرنے کے بعد حکومت اس بات سے بھی دلچسپی لے کہ ان کی عورتوں اور ان کے بچوں کو کہیں سے رزق نہ ملنے پائے، جہاں ایک آدمی اس جرم پر بھی دھر لیا جائے کہ وہ کسی سیاسی قیدی کے پیچھے اس کے بے سہارا پس ماندوں کی مالی مدد کر رہا ہے۔ یہ حرکتیں ایک ملک کے حکمراں اپنی طاقت کے نشے میں کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ جب تک طاقت ان کے پاس ہے کوئی ان کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اس طرح کی حرکتیں کرنے والوں میں ان کی عزت باقی رہ جائے۔ عزت تو درکنار، ایسے لوگوں کی کوئی ساکھ بھی دنیا میں نہیں ہو سکتی ظاہر داری

کی بنا پر ان کے ساتھ احترام کا نمائشی برتاؤ اس وقت تک ہوتا رہیگا جب تک وہ اپنے ملک کی حکومت پر قابض ہیں۔ مگر ان کے کارناموں کو دیکھ کر سب ہی سمجھ گئے کہ یہ کم ظرف لوگ ہیں، کسی ضابطۂ اخلاق اور آئین تہذیب کے پابند نہیں ہیں، موقع پاکر سب کچھ کر گزرنا ان کے لیے ممکن ہے، اس لیے ان سے حذر کرنا چاہیے۔

پھر سوڈان کے مسئلے میں مصر کو جوزک پہنچی اور پہنچ رہی ہے وہ براہ راست نتیجہ ہے اس فوجی آمریت کا جو مصر میں قائم ہے۔ سوڈان کا مسئلہ مصر کے لیے اہم ترین مسئلہ ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی تمام تر نیل پر منحصر ہے اور نیل سوڈان ہی کے علاقے سے گزر کر مصر میں پہنچتا ہے۔ سالہا سال سے مصر کی تمنا اور کوشش یہ تھی کہ دونوں ملک ایک غیر منفک رابطہ میں منسلک ہو جائیں تاکہ کبھی دونوں کے مفاد آپس میں متصادم نہ ہو سکیں۔ یہ مقصود بالکل قریب الحصول ہو چکا تھا۔ انگریز سوڈان کو یہ حق دینے پر راضی ہو چکے تھے کہ وہ چاہیں تو مصر کے ساتھ مل جائیں اور چاہیں تو اپنی الگ ریاست بنالیں۔ سوڈان کے نئے انتخابات ان لوگوں کو برسر اقتدار لے آئے تھے جو مصر سے اتحاد کو پسند کرتے تھے۔ اب صرف اتنی کسر باقی تھی کہ معاہدے کے مطابق سوڈانی رائے عام اپنا فیصلہ صادر کرے۔ ٹھیک اس نازک موقع پر مصر میں فوجی ڈکٹیٹر شپ نے برہنہ ہو کر اپنے بدترین اوصاف نمایاں کرنے شروع کر دیئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی تھا اور یہی ظاہر ہو کر رہا کہ سوڈان کی رائے عام مصر سے متنفر ہو گئی۔ آخر دنیا کی کونسی قوم ایسی احمق ہو سکتی ہے کہ وہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو فوجی ڈکٹیٹر شپ کی چکی میں پسنے کے لیے سپرد کر دے درآنحالیکہ وہ اس سے بچنے کا موقع پاتی ہو۔ کس کی شامت نے دھکا دیا ہے کہ وہ آزادانہ استصواب رائے میں اس حکومت کے ساتھ مل جانا پسند کرے جس میں سیاسی اختلاف کی سزا پھانسی اور عمر قید سے کم نہ ہو۔ کوئی ملک خود اپنے گھر میں ایک جابرانہ اور ظالمانہ نظام قائم کر کے یہ توقع نہیں کر سکتا کہ وہ کسی دوسرے ملک کی رائے عام کو جیت سکے گا اور اس کو اپنے ساتھ مل جانے کی ترغیب دینے میں کامیاب ہو جائیگا۔

سویز کے مسئلے میں بھی مصر کی فوجی آمریت برطانیہ سے معاملہ کرنے میں درحقیقت بڑی زک اٹھا چکی ہے، اگرچہ وہ اسے اپنی کامیابی سمجھتی ہے، یا کم از کم دنیا کو یقین دلانا چاہتی ہے کہ وہ اس معاملے میں کامیاب رہی ہے۔ جن شرائط پر برطانیہ کو سویز سے اپنی فوجیں ہٹانے پر راضی کیا گیا ہے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ سویز کے جس فوجی اڈے

کو پہلے وہ اپنے خرچ پر قائم کیے ہوئے تھا، اُسے اب مصر اپنے خرچ پر اس کے لیے محفوظ رکھے گا۔ برطانوی خزانے سے جو کروڑوں پونڈ سالانہ اس پر خرچ ہو رہے تھے وہ اسے بچ گئے۔ اس کی فوجیں جو سویز پر پڑی ہوئی تھیں انہیں دوسرے مقامات پر استعمال کرنے کی اسے چھٹی مل گئی۔ اُس کو یہ اطمینان بھی حاصل ہوگیا کہ بین الاقوامی جنگ کے موقع پر یہ اڈا اس کی فوجوں کو تیار ملے گا، اور مصر اس خطرے سے محفوظ نہ ہو سکا کہ جب کبھی اس طرح کی جنگ چھڑے تو وہ اس میں آپ سے آپ الجھ جائے۔ اب یہ ہر صاحب عقل خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ برطانیہ کی کامیابی ہے یا مصر کی؟

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں کوئی ایسی حکومت جو خود اپنی قوم کو طاقت کے زور سے دبا دے اور رائے عام کی تائید کے بغیر فرمانروائی کرے، بین الاقوامی معاملات میں کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتی۔ جو اپنی قوم کو دبائیگا اسے لامحالہ دوسروں سے دبنا پڑیگا۔ کیونکہ اس کے ہمسائے اس بات سے بے خبر نہیں ہوتے کہ قومی طاقت اس کی پشت پر نہیں ہے۔ ملک میں ایک آزاد پریس کی موجودگی، آزاد جماعتوں کی موجودگی، اور آزادانہ انتخابات پر حکومت کے رہنے اور ہٹنے کا انحصار صرف ملک کے اندر ہی مفید نہیں ہے بلکہ بیرونی طاقتوں سے معاملہ کرنے میں بھی اس کے بڑے اہم اثرات ہوتے ہیں۔ جو حکومت رائے عام کی تائید سے برسرِ اقتدار آتی ہے اس کی بات بین الاقوامی برادری میں زیادہ وزنی ہوتی ہے۔ اس سے معاملہ کرتے وقت دنیا سمجھتی ہے کہ یہ معاملہ ایک شخص یا چند اشخاص سے نہیں پوری قوم سے ہو رہا ہے۔ جن شرائط پر قوم کو راضی نہ کیا جا سکے، یا جن شرائط کے خلاف ملک میں ایک طاقتور آواز بلند ہو رہی ہو، ان کو رد کر دینا یا کم از کم ان کو نرم کرانے کی کوشش کرنا ایسی حکومت کے لیے آسان ہوتا ہے۔ مصر کی فوجی آمریت نے اس کے برعکس پوزیشن اختیار کی، حتیٰ کہ عین اُس وقت جبکہ وہ برطانیہ سے سویز کے متعلق معاملہ کرنے جا رہی تھی، اس نے ملک کی ایک ہی بچی کھچی حزب اختلاف کو بھی دبا دیا۔ اس کے بعد وہ برطانیہ سے دب کر معاملہ نہ کرتی تو اور کیا کر سکتی تھی۔

حال میں دنیا کے متعدد مسلمان ملک جس طرح کے انقلابات اور اچانک تغیرات کے آماج گاہ بنتے رہے ہیں انہوں نے بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے وقار کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ آخر

مسلمانوں کو وہ کیا بیماری لگی ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی آزادی کا صحیح استعمال نہیں کر سکتے۔ اپنے ملکوں میں کوئی پائدار اور مستقل نظام قائم نہیں کر سکتے، اور اپنی قومی طاقت کو تعمیر و ترقی کے لیے مجتمع کرنے کے بجائے آپس کی کشمکش اور اقتدار کی چھین جھپٹ اور ایک دوسرے کے بنائے ہوئے کو بگاڑنے میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ اس صورتِ حال نے داخلی حیثیت سے مسلم ریاستوں کو کمزور اور خارجی حیثیت سے بے وزن کر کے رکھ دیا ہے اور اس کے نہایت بُرے اثرات ہر پہلو سے مسلمان ملکوں کے مفاد پر پڑ رہے ہیں۔

دنیا نے آج تک اجتماعی زندگی کے تجربات سے جتنے مفید سبق سیکھے ہیں، یہاں ان سب کو بھلا دیا جاتا ہے اور اُن غلطیوں کو بار بار دُہرایا جاتا ہے جو انسانی تاریخ کے دوران میں پے در پے بُرے نتائج دکھا چکی ہیں۔ مثال کے طور پر اسی فوجی اقتدار کو لیجیے جسے ملکی نظام کی اصلاح کے لیے بڑا سستا نسخہ سمجھ کر مسلمان ملکوں میں بے تکلف استعمال کر ڈالا جاتا ہے۔ بظاہر اس سے زیادہ آسان کوئی بات بھی نہیں ہے کہ ملک کی فوج خود اپنے ملک پر قبضہ کر لے اور مارشل لا کے زور سے اپنا حکم چلانے لگے۔ دنیا کا کوئی ملک بھی اپنے آپ کو خود اپنی فوج سے نہیں بچا سکتا خواہ وہ انگلستان اور امریکہ جیسا طاقتور ہی کیوں نہ ہو۔ مگر فرانس جیسے ملک میں بھی، جہاں آئے دن سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کی نااتفاقی کی وجہ سے وزارتیں بدلتی رہتی ہیں، نہ تو کوئی فوجی لیڈر یہ خواب دیکھتا ہے کہ لاؤ، میں فوج کی طاقت سے اپنے ملک کی اس سیاسی بے ثباتی کا خاتمہ کر کے ایک پائیدار حکومت قائم کر دوں، اور نہ کوئی صدر یا وزیر اعظم ہی اپنے لائحۂ عمل کو (جسے وہ بہر حال مفید ہی سمجھتا ہو گا) نافذ کرنے کے لیے کبھی فوج سے مدد لینے کا خیال کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہاں کے فوجی افسر نالائق یا سیاسی لیڈر فوج کے استعمال سے ناواقف ہیں۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہاں کے فوجی اور سیاسی، دونوں طرح کے لیڈر ملکی سیاست میں فوج کی مداخلت کے نقصانات سے واقف ہیں اور ان میں عقل اور حب الوطنی کی اتنی کمی نہیں ہے کہ جان بوجھ کر اُس غلطی کا ارتکاب کریں جو تاریخ میں کبھی کسی ملک اور قوم کے حق میں بھی مفید ثابت نہیں ہوئی ہے۔ لیکن مسلمانوں میں ایسے بہت سے بہادر فوجی پائے جاتے ہیں جو باہر کچھ فتح کرنے کا موقع نہ پا کر خود اپنے ہی ملک کو فتح کر ڈالتے ہیں، اور یہاں ایسے عقلمند ماہرین سیاست بھی نایاب نہیں ہیں جو ملکی مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے فوج کے ناخن تدبیر کو دعوت دینے میں تامل نہیں کرتے۔

ملکی سیاست میں فوج کی مداخلت اور ملک پر فوجی اقتدار کے نقصانات اس قدر ظاہر باہر ہیں کہ ایک معمولی عقل وخرد کا آدمی بھی ان کو سمجھنے سے قاصر نہیں ہو سکتا فوج اپنے ملک پر حکومت کرنے کے لیے نہیں بلکہ ملک کو بیرونی دشمنوں سے بچانے کے لیے منظم کی جاتی ہے ملک کے لوگ اپنی گاڑھی کمائی سے نکالے ہوئے ٹیکس دیکر اپنے سپاہیوں کے لیے اسلحہ اور تنخواہیں اس لیے مہیا نہیں کرتے کہ یہ سپاہی منظم اور مسلح ہو کر خود انہی کو دبالیں۔ بلکہ یہ سب کچھ وہ اس لیے کرتے ہیں کہ باہر کے دشمنوں سے وہ ان کی آزادی کی حفاظت کریں۔ فوج کو تعلیم و تربیت بھی ملک کا انتظام کرنے کے لیے نہیں دی جاتی بلکہ دشمنوں سے لڑنے کے لیے دی جاتی ہے۔ اسے مار دھاڑ اور سختی و درشتی اس لیے نہیں سکھائی جاتی کہ وہ اپنے ملک اور اپنی ہی قوم کو جوتے کے زور سے سیدھا کرنے کی کوشش کرے اور سنگین کی نوک سے ملک میں اپنا حکم منوائے، بلکہ یہ اوصاف اس میں اعدائے وطن کو سرنگوں کرنے کے لیے پیدا کیے جاتے ہیں۔ اب اگر اخلاقی حیثیت سے دیکھیے تو اس سے بڑی غداری کوئی نہیں ہو سکتی کہ ایک فوج جن لوگوں کے روپے سے منظم اور مسلح ہوئی ہو وہ طاقت پا کر خود انہی کی گردن پر سوار ہو جائے اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک گھر کے چوکیدار ایکا کر کے خود گھر پر قابض ہو جائیں۔ بلکہ اس سے بھی بدتر مثال اس فعل کی یہ ہے کہ جوان بیٹے ماں باپ کی محنتوں سے پروان چڑھ کر خود ماں باپ ہی کے سینے پر سوار ہو جائیں۔ اور اگر مصلحت کے لحاظ سے دیکھیے تو اس حرکت کے تین نتائج بالکل کھلے ہوئے ہیں جو لازماً اس سے رونما ہوتے ہیں

اول یہ کہ ملک کے باشندے خود اپنی فوج سے متنفر ہو جائیں اور ملک کی حفاظت کے لیے فوج اور قوم کا تعاون ممکن نہ رہے۔

دوم یہ کہ باشندگانِ ملک کا جذبۂ حبِ وطن ایک جابرانہ نظام میں رہتے رہتے بالآخر سرد پڑ جاتا ہے۔ نہیں اس امر سے کوئی دلچسپی نہ رہے کہ ملک کا بھلا ہوتا ہے یا برا، بلکہ وہ آزاد بھی رہتا ہے یا نہیں۔

سوم یہ کہ ملک ایسے انقلابات و تغیرات کی آماجگاہ بن جائے جو باشندگانِ ملک کے افکار و اقدار اور خواہشات کی تبدیلیوں کا نتیجہ نہ ہوں بلکہ سازشوں اور طاقت کے خلاف طاقت کے استعمال کا نتیجہ ہوں۔

تھوڑی دیر کے لیے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کسی وقت ایک ظالم شخص یا گروہ کی حکمرانی سے ملک کو نجات دلانے کے لیے فوجی انقلاب ناگزیر ہو جاتا ہے، تب بھی ہم یہ کہیں گے کہ کوئی صاحبِ عقل اور محبِ وطن فوجی گروہ یہ حماقت نہیں کر سکتا کہ وہ ظالموں کو ہٹانے کے بعد خود ملک پر مسلط ہو جائے۔ وہ اگر کچھ بھی عقل اور خیر خواہی کا جذبہ رکھتا ہو تو اسے انقلاب کے بعد پہلا قدم یہ اٹھانا چاہیے کہ ملک میں آزادانہ انتخابات منعقد کرا کے ملک کا انتظام نمائندگانِ ملک کے حوالے کرے اور خاموشی کے ساتھ اپنی بارکوں میں واپس چلا جائے۔

تفہیم القرآن

الحج

نام چوتھے رکوع کی دوسری آیت وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول اس سورے میں مکی اور مدنی سورتوں کی خصوصیات ملی جلی پائی جاتی ہیں۔اسی وجہ سے مفسرین میں اس امر پر اختلاف ہوا ہے کہ یہ مکی ہے یا مدنی۔لیکن ہمارے نزدیک اس کے مضامین اور اندازِ بیان کا یہ رنگ اس وجہ سے ہے کہ اس کا ایک حصہ مکی دَور کے آخر میں اور دوسرا حصہ مدنی دَور کے آغاز میں نازل ہوا ہے۔اس لیے دونوں ادوار کی خصوصیات اس میں جمع ہو گئی ہیں۔

ابتدائی حصے کا مضمون اور اندازِ بیان صاف بتاتا ہے کہ یہ مکہ میں نازل ہوا ہے اور اغلب یہ ہے کہ مکی زندگی کے آخری دَور میں ہجرت سے کچھ پہلے نازل ہوا ہو۔یہ حصہ آیت نمبر ۲۴ (وَھُدُوْٓا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَھُدُوْٓا اِلٰی صِرَاطِ الْحَمِیْدِ) پر ختم ہوتا ہے۔

اس کے بعد اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللہِ سے یک لخت مضمون کا رنگ بدل جاتا ہے اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سے آخر تک کا حصہ مدینۂ طیبہ میں نازل ہوا ہے۔بعید نہیں کہ یہ ہجرت کے بعد پہلے ہی سال ذی الحجہ میں نازل ہوا ہو، کیونکہ آیت ۲۵ سے ۴۱ تک کا مضمون اسی بات کی نشان دہی کرتا ہے، اور آیت ۳۹-۴۰ کی شانِ نزول بھی اس کی مؤید ہے۔اُس وقت مہاجرین ابھی تازہ تازہ ہی اپنے گھر بار چھوڑ کر مکہ سے آئے تھے۔حج کے زمانے میں اُن کو اپنا شہر اور حج کا اجتماع یاد آ رہا ہوگا اور یہ بات بری طرح کھل رہی ہو گی کہ مشرکینِ قریش نے اُن پر مسجدِ حرام کا راستہ تک بند کر دیا ہے۔اُس زمانے میں وہ اِس بات کے بھی منتظر ہونگے کہ جن ظالموں نے ان کو گھروں سے نکالا، مسجدِ حرام

کی زیارت سے محروم کیا، اور خدا کا راستہ اختیار کرنے پر ان کی زندگی تنگ و دشوار کر دی، اُن کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت مل جائے۔ یہ ٹھیک نفسیاتی موقع تھا ان آیات کے نزول کا۔ ان میں پہلے توحج کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ مسجدِ حرام اس لیے بنائی گئی تھی اور یہ حج کا طریقہ اس لیے شروع کیا گیا تھا کہ دنیا میں خدائے واحد کی بندگی کی جائے، مگر آج وہاں شرک ہو رہا ہے اور خدائے واحد کی بندگی کرنے والوں کے لیے اس کے راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کو اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ ان ظالموں کے خلاف جنگ کریں اور انہیں بے دخل کر کے ملک میں وہ نظامِ صالح قائم کریں جس میں برائیاں دبیں اور نیکیاں فروغ پائیں۔ ابن عباس، مجاہد، عُروہ بن زبیر، زید بن اسلم، مُقاتل بن حَیان، قَتادہ اور دوسرے اکابر مفسرین کا بیان ہے کہ یہ پہلی آیت ہے جس میں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی۔ اور حدیث و سیرت کی روایات سے ثابت ہے کہ اس اجازت کے بعد فوراً ہی قریش کے خلاف عملی سرگرمیاں شروع کر دی گئیں اور پہلی مہم صفر ۲ھ میں ساحل بحر احمر کی طرف روانہ ہوئی جو غزوۂ وَدّان یا غزوۂ اَبْواء کے نام سے مشہور ہے۔

موضوع و مبحث اس سورہ میں تین گروہ مخاطب ہیں، مشرکینِ مکہ، مذبذب اور متردد مسلمان، اور مومنینِ صادقین۔

مشرکین سے خطاب کی ابتدا مکہ میں کی گئی اور مدینے میں جا کر اس کا سلسلہ پورا کیا گیا۔ اس خطاب میں ان کو پورے زور کے ساتھ تنبیہ کیا گیا ہے کہ تم نے ضد اور ہٹ دھرمی کے ساتھ اپنے بے بنیاد جاہلانہ خیالات پر اصرار کیا، خدا کو چھوڑ کر اُن معبودوں پر اعتماد کیا جن کے پاس کوئی طاقت نہیں ہے، اور خدا کے رسول کو جھٹلایا۔ اب تمہارا انجام وہی کچھ ہو کر رہے گا جو تم سے پہلے اس روش پر چلنے والوں کا ہو چکا ہے۔ نبی کو جھٹلا کر اور اپنی قوم کے صالح ترین عنصر کو نشانۂ ستم بنا کر تم نے اپنا ہی کچھ بگاڑا ہے۔ اس کے نتیجے میں خدا کا جو غضب تم پر نازل ہو گا اس سے تمہارے بناوٹی معبود تمہیں نہ بچا سکیں گے۔ اس تنبیہ و انذار کے ساتھ افہام و تفہیم کا پہلو بالکل خالی نہیں چھوڑ دیا گیا ہے۔ پوری سورۃ میں جگہ جگہ تذکیر اور نصیحت بھی ہے اور شرک کے خلاف اور توحید و آخرت کے حق میں مؤثر دلائل بھی پیش کیے گئے ہیں۔

مذبذب مسلمان، جو خدا کی بندگی قبول تو کر چکے تھے مگر اس راہ میں کوئی خطرہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے، ان کو خطاب کرتے ہوئے سخت سرزنش کی گئی ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ یہ آخر کیسا ایمان ہے کہ راحت، مسرت، عیش نصیب ہو تو خدا تمہارا خدا اور تم اس کے بندے۔ مگر جہاں خدا کی راہ میں مصیبت آئی اور سختیاں جھیلنی پڑیں، پھر نہ خدا تمہارا خدا رہا اور نہ تم اس کے بندے رہے۔ حالانکہ تم اپنی اس روش سے کسی ایسی مصیبت اور نقصان اور تکلیف کو نہیں ٹال سکتے جو خدا نے تمہارے نصیب میں لکھ دی ہو۔

اہل ایمان سے خطاب دو طریقوں پر کیا گیا ہے۔ ایک خطاب ایسا ہے جس میں وہ خود بھی مخاطب ہیں اور عرب کی رائے عام بھی، مگر دوسرے خطاب میں صرف اہل ایمان مخاطب ہیں۔

پہلے خطاب میں مشرکین مکہ کی اس روش پر گرفت کی گئی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے لیے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے، حالانکہ مسجد حرام اُن کی ذاتی جائداد نہیں ہے اور وہ کسی کو حج سے روکنے کا حق نہیں رکھتے یہ اعتراض نہ صرف یہ کہ بجائے خود حق بجانب تھا، بلکہ سیاسی حیثیت سے یہ قریش کے خلاف ایک بہت بڑا حربہ بھی تھا۔ اس سے عرب کے تمام دوسرے قبائل کے ذہن میں یہ سوال پیدا کر دیا گیا کہ قریش حرم کے مجاور ہیں یا مالک؟ اگر آج اپنی ذاتی دشمنی کی بنا پر وہ ایک گروہ کو حج سے روک دیتے ہیں اور اس کو برداشت کر لیا جاتا ہے تو کیا بعید ہے کہ کل جس سے بھی ان کے تعلقات خراب ہوں اس کو وہ حدودِ حرم میں داخل ہونے سے روک دیں اور اس کا عمرہ و حج بند کر دیں۔ اس سلسلے میں مسجد حرام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ایک طرف یہ بتایا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جب خدا کے حکم سے اس کو تعمیر کیا تھا تو سب لوگوں کو حج کا اذن عام دیا تھا اور وہاں اول روز سے مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق یکساں قرار دیے گئے تھے۔ دوسری طرف یہ بتایا گیا ہے کہ یہ گھر شرک کے لیے نہیں بلکہ خدائے واحد کی بندگی کے لیے تعمیر ہوا تھا، اب یہ کیا غضب ہے کہ وہاں ایک خدا کی بندگی تو ہو ممنوع اور بتوں کی پرستش کے لیے ہو پوری آزادی۔

دوسرے خطاب میں مسلمانوں کو قریش کے ظلم کا جواب طاقت سے دینے کی اجازت عطا کی گئی ہے اور ساتھ ساتھ ان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب تمہیں اقتدار حاصل ہو تو تمہاری روش کیا ہونی چاہیے

اور اپنی حکومت میں تم کو کس مقصد کے لیے کام کرنا چاہیے۔ یہ مضمون سورہ کے وسط میں بھی ہے اور آخر میں بھی۔ آخر میں گروہ اہل ایمان کے لیے "مسلم" کے نام کا باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ ابراہیم کے اصل جانشین تم لوگ ہو، تمہیں اس خدمت کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے کہ دنیا میں شہادت علی الناس کے مقام پر کھڑے ہو، اب تمہیں اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ اور فعل الخیرات سے اپنی زندگی کو بہترین نمونے کی زندگی بنانا چاہیے اور اللہ کے اعتماد پر اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرنا چاہیے۔

اس موقعہ پر سورۂ بقرہ اور سورۂ انفال کے دیباچوں پر بھی نگاہ ڈال لی جائے تو سمجھنے میں زیادہ سہولت ہوگی۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

لوگو! اپنے رب کے غضب سے بچو، حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے[1]۔

---

[1] یہ زلزلۂ قیامت کی ابتدائی کیفیات میں سے ہے اور اغلب یہ ہے کہ اس کا وقت وہ ہوگا جبکہ زمین یکایک الٹی پھرنی شروع ہو جائے گی اور سورج مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہوگا۔ یہی بات قدیم مفسرین میں سے عَلْقَمہ اور شَعْبی نے بیان کی ہے کہ یکون ذالک عند طلوع الشمس من مغربھا۔ اور یہی بات اُس طویل حدیث سے معلوم ہوتی ہے جو ابن جریر اور طبرانی اور ابن ابی حاتم وغیرہ نے حضرت ابوہُرَیرہ کی روایت سے نقل کی ہے۔ اُس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ نفخ صور کے تین مواقع ہیں۔ ایک نفخ فَزَع، دوسرا نفخ صَعْق اور تیسرا نفخ قیام لرب العالمین۔ یعنی پہلا نفخ عام سراسیمگی پیدا کرے گا، دوسرے نفخ پر سب مر کر گر جائیں گے اور تیسرے نفخ پر سب لوگ زندہ ہو کر خدا کے حضور پیش ہو جائیں گے۔ پھر پہلے نفخ کی تفصیلی کیفیت بیان کرتے ہوئے آپ بتاتے ہیں کہ اُس وقت زمین کی حالت اُس کشتی کی سی ہوگی جو موجوں کے تھپیڑے کھا کر ڈگمگا رہی ہو، یا اُس معلق قندیل کی سی جس کو ہوا کے جھونکے بُری طرح جھنجھوڑ رہے ہوں۔ اُس وقت زمین کی آبادی پر جو کچھ گزرے گی اُس کا نقشہ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر کھینچا گیا ہے۔ مثلاً

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ — پس جب صور میں ایک پھونک ماری جائے گی